

مولانا امتیاز علی خاں عرشی

خلیق انجم

پچھلی نصف صدی میں ہندوستان کے عربی، فارسی کے جن دانش وروں کو ہندوستان سے باہر کی علمی دنیا میں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی اور جن کے علمی اور ادبی کارناموں کا اعتراف کیا گیا ہے ان میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی مرحوم، قاضی عبدالودود، مالک رام، پروفیسر نذیر احمد اور پروفیسر امیر حسن عابدی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

عرشی صاحب مرحوم کو عرب دنیا میں اور نذیر صاحب کو ایران میں بہت عزت اور احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ مجھے ان پانچوں بزرگوں سے قربت کا فخر حاصل ہے۔ یہ حضرات میرے نہ صرف بزرگ بلکہ معنوی استاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔

عرشی صاحب سے میری پہلی ملاقات تمیں، چالیس سال پہلے رام پور میں ان دنوں ہوئی تھی جب میں اسلم پرویز دہلی کالج (موجودہ ذاکر حسین کالج) سے اردو میں ایم۔اے کر رہے تھے۔ رام پور میں تقریروں کا مقابلہ تھا جس میں شرکت کے لیے دہلی کالج سے میں اور اسلم پرویز گئے تھے۔ ہم لوگ ایک دن پہلے پہنچ گئے تھے۔ شام کو ایک نوجوان بہت ہی خوب صورت، دبلا پتلا، گندمی رنگ، لمبے لمبے خوب صورت بال، بڑی بڑی آنکھیں، چوڑا ماتھا اور دلکش شخصیت کے مالک ہم سے ملنے مہمان خانے میں آئے۔ انہوں نے اپنا نام بتایا اکبر علی خاں۔ ہم لوگ بہت جلد بے تکلف ہو گئے اور بہت دیر تک مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے رہے۔ معلوم ہوا کہ اکبر علی خاں کو فارسی پر اچھی قدرت حاصل ہے اور وہ اردو میں شاعری کے ساتھ ساتھ تنقیدی مضامین بھی لکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تھیلے میں سے ایک بیاض نکالی اور لگ بھگ پون گھنٹے تک ہمیں اپنا کلام سنایا۔ میں نے ہمیشہ ہی شاعروں کی صحبت سے گریز کیا کیونکہ ان کا کلام بلاغت نظام سننے کے لیے جس ہمت، حوصلے اور قوت برداشت کی ضرورت ہوتی ہے وہ مجھ میں پہلے تھی اور نہ اب

ہے۔ مگر پردیس میں ہونے کی وجہ سے ہمیں اکبر علی خاں کو بڑی سنجیدگی اور توجہ سے سننا پڑا! مرحوم کو شعر کہنے کا سلیقہ آتا تھا۔ بہت اچھے شعر کہتے تھے۔ اگر وہ اپنی پوری توجہ شاعری پر ہی صرف کرتے تو یقیناً ہمارے زمانے کے اچھے شاعروں میں ان کا شمار ہوتا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ اکبر صاحب جب رخصت ہونے لگے تو انہوں نے مجھے اور اسلم صاحب کو دوسرے دن شام کو اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی۔ ہمارے لیے یہ بالکل نیا تجربہ تھا کیونکہ اس سے پہلے ہمیں کسی نے کھانے پر نہیں بلایا تھا۔ اس لیے ہم فوراً راضی ہو گئے۔ دوسرے دن شام کو تقریروں کا مقابلہ ہوا۔ آگے کی صف میں ایک بزرگ بیٹھے ہوئے تھے۔ پینتالیس پچاس سال کی عمر۔ انہیں دیکھ کر مجھے اپنے خاندان کے ایک بزرگ یاد آ گئے۔ جب میں بچہ تھا تو افغانستان سے ہمارے ایک رشتہ دار پہلی بار ہم لوگوں سے ملنے کے لیے ہندوستان آئے۔ وہ اصل پٹھان تھے۔ کیسی باوقار شخصیت تھی۔ میں تو انہیں دیکھتا رہ گیا۔ بڑی باوقار شخصیت تھی ان کی۔ تقریروں کے مقابلے میں جو صاحب اگلی صف میں بیٹھے تھے وہ بالکل ہمارے خاندن کے ان بزرگ سے بہت ملتے جلتے تھے۔ بالکل وہی حلیہ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ یہ حضرت مولانا امتیاز علی خاں عرشی ہیں۔ ہم ان کے ادبی کارناموں سے واقف نہیں تھے کیونکہ ادب میں ہم اپنے عہد کے صرف شاعروں، ناول نگاروں اور افسانہ نویسوں ہی سے واقف تھے۔ ہمیں اس کا قطعی علم نہیں تھا کہ عرشی صاحب کو علمی دنیا میں اتنا بڑا مرتبہ حاصل ہے! بڑی بڑی روشن اور چمک دار آنکھیں، لمبی ناک، چوڑا ماتھا۔ شیروانی پہنے ہوئے تھے۔ تنگ مہری کا پاجامہ، سیدھی باڑ کی ٹوپی لگائے ہوئے تھے! پوری محفل میں وہ سب سے الگ تھے۔ میری نظریں انہیں پر جمی ہوئی تھیں جس کی ایک وجہ تو عرشی صاحب کی پروقار شخصیت اور دوسرے یہ کہ وہ اوپر سے نیچے تک بالکل میرے ان رشتے دار کی تصویر بنے ہوئے تھے جو میرے بچپن میں ملنے کے لیے افغانستان سے ہندوستان آئے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ جو میرے عزیز تھے ان کے سر پر پگڑی تھی، وہ کوٹ اور شلوار پہنے ہوئے تھے اور عرشی صاحب ٹوپی اور شیروانی۔ دوسرے دن ہم اکبر علی خاں صاحب کے یہاں کھانے پر گئے تو عرشی صاحب وہاں موجود تھے۔ وہاں ہمیں معلوم ہوا کہ عرشی صاحب اکبر صاحب کے والد ہیں۔ جس محبت، خلوص اور پیار سے عرشی صاحب ہم سے ملے، میرے ذہن پر اس کے اثرات آج تک برقرار ہیں۔ ہم لوگوں نے کھانا ایک ساتھ کھایا اور کھانے کے دوران وہ باتیں کرتے رہے۔ بہت ہی نرم اور دھیمے لہجے میں۔ میرے

خاندان کے بارے میں معلومات کیں۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میرا خاندان تین چار نسلوں پہلے رام پور سے تعلق رکھتا تھا تو وہ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے میرے رام پوری بزرگوں کا نام پوچھا۔ مجھے صرف ایک ہی نام یاد تھا اور وہ تھا بڈے خاں۔ میرے خاندان کی روایت کے مطابق ہمارے پردادا ان ہی بزرگ کی غیر قانونی حرکتوں کی وجہ سے رام پور چھوڑ کر دہلی آئے تھے۔ میں نے جب وہ نام بتایا تو عرشی صاحب کے منہ سے بے ساختہ نکلا جناب وہ تو بہت بڑے شہدے تھے۔ میں اس فقرے سے بہت نروس ہو گیا لیکن فوراً بات کو سنبھالتے ہوئے میں نے کہا کہ ان کے شہدے پن ہی کی وجہ سے تنگ آ کر تو ہمارے پردادا دہلی آئے تھے۔ اس کے بعد عرشی صاحب نے ادبی گفتگو چھیڑ دی اور اس موضوع پر بہت دیر تک بات کرتے رہے۔ ہم لوگ گفتگو میں معروف تھے اور اکبر علی خاں بے چارے ہم لوگوں کو کھانا کھلانے میں لگے رہے۔ جب ہم لوگوں نے کھانا شروع کر دیا تو وہ ایک خاموش سامع کی حیثیت سے بیٹھے رہے۔ اکبر اپنے والد کا بہت احترام کرتے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹے تک یہ صحبت بہت دلچسپ رہی۔ ہاں! یہ بتانا بھول گیا کہ عرشی صاحب نے اسلم پرویز اور میری تقریروں کی تعریف کی اور کچھ مشورے بھی دیے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ان کا ایک مشورہ یہ تھا کہ آپ بہت تیز اور اونچی آواز میں بولتے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ ذرا ہلکے انداز میں بولیں تا کہ لوگوں کے دل و دماغ کو متاثر کر سکیں۔ دوسرے دن ہم دہلی آ گئے لیکن عرشی صاحب کی شخصیت دل و دماغ پر چھائی رہی۔

مجھے دہلی یونی ورسٹی نے پی ایچ ڈی کے لیے مرزا مظہر جان جاناں کا موضوع دیا۔ مجھ پر یہ موضوع اس انداز سے تھوپا گیا تھا کہ میرے لیے انکار ممکن نہیں تھا۔ میں مرزا محمد رفیع سودا پر کام کرنا چاہتا تھا۔ مگر مرزا مظہر جان جاناں پر تحقیقی مقالہ لکھنے پر مجبور تھا۔ مرزا مظہر جان جاناں اور مرزا محمد رفیع سودا کا ایک ہی زمانہ تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ مرزا مظہر جان جاناں سودا سے عمر میں بڑے تھے لیکن تھے دونوں ہم عصر۔ میں نے ایک کام یہ کیا کہ مرزا مظہر کے ساتھ سودا پر بھی تحقیق شروع کر دی۔ ہندوستان کی جن لائبریریوں میں، میں اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں جاتا تھا وہاں مرزا مظہر جان جاناں کے ساتھ سودا پر بھی نوٹس لے لیتا تھا۔

دہلی یونی ورسٹی میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ یونی ورسٹی میں پیش کرنے کے بعد میں نے سودا پر کتاب لکھنی شروع کر دی۔ ابھی چار پانچ باب ہی لکھے تھے کہ پروفیسر آل احمد سرور نے

میری ملاقات ہوگئی۔انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آج کل کیا کر رہے ہو۔میں نے اپنے سودا کے پراجیکٹ کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔انہوں نے کہا کہ آپ نے جہاں تک لکھ لیا ہے وہ ذرا مجھے دکھا دیجئے۔میں نے دو تین دن میں ڈاک سے شروع کے تین چار ابواب سرور صاحب کو بھیج دیے۔یہ سرور صاحب کا کرم اور نوازش تھی کہ انہوں نے فوراً تحریر فرمایا کہ اگر آپ پسند فرمائیں تو انجمن ترقی اردو یہ کتاب چھاپنے پر غور کرسکتی ہے۔اگر آپ کو میری تجویز منظور ہے تو یہ کتاب جلد سے جلد مکمل کر دیجئے۔مجھے اور کیا چاہیے تھا۔میں نے لگ کر چھ سات مہینے میں یہ کام مکمل کر کے مسودہ سرور صاحب کو بھیج دیا۔ایک دو مہینے بعد سرور صاحب کا خط آیا کہ ادبی کمیٹی نے میری کتاب منظور کر لی ہے اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی کو اس کا ایکسپرٹ مقرر کیا ہے۔مجھے ڈر تھا کہ میں عرشی صاحب کے ادبی معیار پر شاید پورا نہ اتر سکوں اس لیے مجھے خدشہ تھا ایسا نہ ہو کہ عرشی صاحب میرا مقالہ نامنظور کر دیں۔بہر حال کچھ دن بعد عرشی صاحب کا خط آیا۔انہوں نے لکھا تھا کہ انجمن ترقی اردو نے میرا مقالہ رائے کے لیے ان کے پاس بھیجا ہے۔انہوں نے یہ بھی لکھا کہ محض خط لکھنے سے تو بات نہیں بنے گی۔میں چاہتا ہوں کہ کسی دن آپ رام پور آجایئے، آپ ہمارے ساتھ قیام فرمایئے۔ہم اس کتاب کے بارے میں بات کرلیں گے۔اب مجھے اور زیادہ پریشانی ہوگئی۔میں نے سوچا کہ وہ میرا مسودہ نامنظور کریں گے اور مجھے تسلی دینے کے لیے بلایا ہے۔بہر حال میں رام پور پہنچ گیا۔

چونکہ مرزا مظہر جان جاناں اور مرزا محمد رفیع سودا کے موضوعات پر کام کے دوران میں کئی بار رضا لائبریری (رام پور) گیا تھا اور وہاں عرشی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔اس لیے اب میں ان کی ادبی حیثیت سے واقف ہو چکا تھا۔

عرشی صاحب نے مہمان خانے میں میرے قیام کا انتظام کر رکھا تھا۔جب میں پہنچا تو شام کا وقت تھا۔لائبریری بند ہوگئی تھی۔میں نے چوکی دار کو بتایا کہ دہلی سے آیا ہوں اور عرشی صاحب نے مجھے بلایا ہے۔عرشی صاحب اسے پہلے ہی ہدایت دے چکے تھے۔وہ فوراً مہمان خانے میں لے گیا اور مجھ سے کہا کہ آپ نہادھو لیں میں چائے لے کر آتا ہوں۔میں جب نہادھو کر باہر آیا تو چائے رکھی ہوئی تھی۔چائے پی چکا تو وہ چوکی دار مجھے عرشی صاحب کے دولت کدے پر لے گیا۔عرشی صاحب لان میں بچھی ہوئی دو کرسیوں میں سے ایک کرسی پر تشریف

رکھتے تھے اور دوسری خالی تھی۔ سامنے ایک چھوٹی سی میز رکھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے اور میرے استقبال کے لیے کئی قدم آگے آئے۔ ہاتھ ملایا اور میرا ہاتھ پکڑ کر وہاں لے گئے اور مجھے دوسری کرسی پر بٹھا دیا۔ خیر و عافیت پوچھنے کے بعد انہوں نے بتایا کہ اکبر علی خاں کچھ دیر کے لیے باہر گئے ہوئے ہیں ابھی آتے ہوں گے۔ گویا انہیں اس کا احساس تھا کہ مجھے اکبر علی خاں سے ملاقات کی فکر ہو گی۔ کچھ دیر میں اکبر علی خاں صاحب بھی آ گئے اور عرشی صاحب اٹھ کر زنان خانے میں چلے گئے۔ بہت دیر تک میں اور اکبر باتیں کرتے رہے اور پھر اکبر نے میز پر کھانا لگایا اور اندر سے ایک کرسی اور لے آئے۔ جب کھانا لگ گیا تو وہ عرشی صاحب کو بھی بلا لائے۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ کیا کھانا تھا یہ تو مجھے یاد نہیں۔ ہاں یہ یاد ہے کہ بہت مزے کا تھا۔ کھانے کے بعد عرشی صاحب نے کہا کہ کل صبح آپ مجھے لائبریری میں مل لیجئے تو ہم اس مسودے کے بارے میں بات کر لیں گے۔ مجھے یہ خوف تھا کہ کہیں میرا مقالہ رد نہ کر دیں۔ اپنی خود اعتمادی کی بنیاد پر میں نے پوچھ لیا کہ محترم! میرے مقالے کے بارے میں تفصیل سے گفتگو تو آپ کل فرمائیں گے لیکن آج مجھے صرف یہ بتا دیجئے کہ اس کے بارے میں بحیثیت مجموعی آپ کی کیا رائے ہے؟ عرشی صاحب میری پریشانی کو سمجھ گئے۔ میرے قریب آئے اور میرا کاندھا تھپکتے ہوئے کہا یہ ایک ایسا کام ہے جو اردو میں آپ کے نام کو زندہ رکھے گا۔ بس اب کل باتیں ہوں گی اور یہ کہہ کر وہ گھر میں چلے گئے۔ اکبر اور میں مہمان خانے میں آ گئے جہاں ہم لوگوں نے دنیا بھر کی باتیں اور شعر و شاعری کی۔ دوسرے دن جب میں لائبریری پہنچا تو عرشی صاحب میرے منتظر تھے۔ میرے پہنچتے ہی انہوں نے چپڑاسی سے چائے لانے کو کہا اور پھر انہوں نے میرا مسودہ کھول کر وہ مقامات نکالے جہاں انہوں نے نشان لگا رکھے تھے۔ میں نے ایک دو جگہ حوالے دینے میں غلطی کی تھی۔ کہیں عبارت میں کچھ فرق ہو گیا تھا اور کہیں کتاب کا حوالہ ٹھیک سے نہیں دیا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ خان آرزو کے تذکرے "مجمع النفائس" کا جو میں نے حوالہ دیا تھا اسے نقل کرنے میں اس کے متن میں غلطیاں ہو گئی تھیں۔ عرشی صاحب نے لائبریری سے دو تین کتابیں منگوا کر اپنی میز پر رکھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے "مجمع النفائس" میں ایک جگہ پر کاغذ رکھا ہوا تھا۔ اسے نکال کر انہوں نے بتایا کہ آپ سے عبارات نقل کرنے میں کچھ سہو ہوا ہے۔ اس کو آپ ذرا درست کر لیجئے۔ اسی طرح دو تین اور کتابوں کے حوالوں کی تصحیح کی۔ اس وقت ایک دلچسپ بات ہوئی اور

یہاں مجھے یہ اندازہ ہوا کہ ان میں کیسی قوت برداشت تھی اور وہ نوجوان نسل کی رائے کا کیسا احترام کرتے تھے۔ میں مرزا مظہر جان جاناں کا جہاں کہیں ذکر کیا ان کا صرف نام لکھا تھا۔ نام کے ساتھ احتراماً حضرت یا اسی طرح کا کوئی لفظ نہیں لکھا تھا۔ عرشی صاحب نے فرمایا کہ دیکھیے یہ اپنے زمانے کے بہت بڑے صوفی بزرگ تھے ان کے ساتھ آپ کو حضرت تو لکھنا ہی چاہیے۔ اس زمانے میں میری عمر وہ تھی جس عمر میں نوجوان کو اپنے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں ہوتی ہیں اور وہ کسی کو اپنے سامنے کچھ نہیں سمجھتا۔ میں عرشی صاحب کا دل و جان سے احترام تو کرتا تھا لیکن ان کی یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے عرض کیا کہ اگر میں مرزا مظہر بحیثیت صوفی کے ساتھ موضوع پر کام کروں گا تو حضرت لگاؤں گا۔ میں نے ایک شاعر پر کام کیا ہے اور شاعر کے ساتھ حضرت یا احترام کا کوئی اور لفظ اس کے مرتبے کو کم کرتا ہے۔ میری دلیل عرشی صاحب کی سمجھ میں نہیں آئی بلکہ پسند بھی نہیں آئی۔ مگر یہ ان کی عظمت تھی کہ انہوں نے مسکرا کر کہا کہ جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ میرے اس مسودے پر خاصی دیر تک بات کی اور قیمتی مشوروں سے نوازا۔ میں دہلی آ گیا تو میں نے عرشی صاحب کے مشورے کے مطابق مسودے میں مناسب تبدیلیاں کردیں۔ عرشی صاحب مرحوم میرے اس کام سے بہت خوش تھے۔ جب کتاب چھپ کر آئی تو میں یہ کتاب لے کر رام پور ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بے انتہا خوش ہوئے۔ کہنے لگے کہ اب بھی اگلے زمانے کے لوگ موجود ہیں۔ یہ اخلاق تو نئی نسل میں بالکل ختم ہو گیا ہے۔ بہر حال میں ایک دن رام پور رہا اور عرشی صاحب کی میزبانی کا لطف اٹھا کر واپس آ گیا۔

عرشی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کبھی کسی کی غیبت نہیں کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں ان کی خدمت میں حاضر تھا تو ایک اور صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے جنہوں نے ایک پروفیسر کے کسی کام پر اعتراض کرتے ہوئے پروفیسر کی برائیاں شروع کردیں۔ عرشی صاحب نے فرمایا کہ اگر ان پروفیسر صاحب نے ایسا کیا تو کچھ سوچ سمجھ کر ہی کیا ہوگا۔ ان کی مجبوریوں سے میں اور آپ واقف نہیں ہیں۔ وہ صاحب پھر بھی پروفیسر کے خلاف بولتے رہے۔ عرشی صاحب نے کہا کہ دیکھیے جو باتیں آپ کر رہے ہیں وہ ان پروفیسر صاحب سے براہ راست کریں تو مناسب ہوگا۔ مجھے آپ یہ سب کچھ بتا کر اپنا اور میرا وقت خراب کر رہے ہیں۔ عرشی صاحب کے لہجے میں اتنی تلخی تھی کہ وہ صاحب سمجھ گئے اور انہوں نے موضوع بدل دیا۔ مجھے یاد نہیں ہے کہ

میں نے کبھی عرشی صاحب کے منہ سے کسی کی برائی سنی ہو۔ عرشی صاحب کی جو خوبیاں میرے ذہن میں موجود ہیں ان میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ مجھ سے اس طرح کی گفتگو کرتے تھے کہ جیسے میں ان کا ہم عمر ہوں اور علم میں ان کا ہم پلہ۔ بعض اوقات گفتگو کا انداز ایسا ہوتا تھا جیسے علم کے معاملے میں میرا مرتبہ ان سے بلند ہے اور میرے ہی ساتھ نہیں اکثر چھوٹوں کے ساتھ میں نے انہیں اسی انداز میں گفتگو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

میں نے مظہر جان جاناں کے فارسی خطوط مرتب کر کے ان کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ''برہان دہلی'' میں قسط وار شائع ہو رہا تھا (بعد میں یہ کتابی صورت میں چھپا)۔ عرشی صاحب کا ایک دفعہ خط آیا کہ آپ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط کا ترجمہ شائع کر کے بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ میں اس ترجمے سے استفادہ کر رہا ہوں۔ آپ کے اس کام سے اردو ادب کو فائدہ پہنچے گا۔ اس کام کی خاصی تعریف کر کے انہوں نے لکھا کہ آپ نے عبداللہ انصاری پر حاشیہ لکھا ہے اور آپ نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے میرے علم کے مطابق یہ وہ عبداللہ انصاری نہیں ہے۔ انہیں سمجھنے میں آپ سے سہو ہوا ہے۔ وہ دوسرے ہیں۔ اور اس کے بعد انہوں نے بہت ہی نرم اور مہذب الفاظ میں عبداللہ انصاری کے بارے میں تفصیلات بیان کیں۔ یہ ان کی علمی عظمت تھی۔ اگر ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو وہ اس موقعے کا استعمال اپنی بڑائی ثابت کرنے کے لیے کرتا۔

عرشی صاحب کو شاید غصہ نہیں آتا تھا۔ مجھے بارہا ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا لیکن میں نے انہیں کبھی غصہ کرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ مگر تھے تو پٹھان۔ ایک آدھ دفعہ ان کے اندر کا پٹھان باہر بھی آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ ''آج کل'' کے ایڈیٹر نے انہیں خط لکھ کر ایک مقالے کی فرمائش کی۔ ان دنوں عرشی صاحب بہت معروف تھے اس لیے انہوں نے معذرت کر لی۔ ایڈیٹر صاحب کی جو شامت آئی تو انہوں نے لکھا کہ ادارہ ان کے مقالے کا معاوضہ دو سو روپے دے گا۔ بس عرشی صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے غصے میں ایک خط لکھا جو ''آج کل'' کے ایڈیٹر نے مجھے دکھایا تھا۔ عرشی صاحب نے کچھ اس طرح لکھا تھا کہ:

''حضرت! میں فقیر آدمی ہوں علمی کام روپے کمانے کے لیے نہیں کرتا۔ میرے مقالے کی قیمت آپ نے دو سو روپے لکھی ہے مگر میرا خیال ہے کہ ادارہ 'آج کل' تو کیا حکومت ہند بھی اگر چاہے تو میرے خون جگر کی قیمت نہیں ادا کر سکتی۔''

میں نے بہت کوشش کی ایڈیٹر صاحب اس خط کی نقل مجھے دے دیں مگر انہوں نے مناسب نہیں سمجھا۔

ایک دفعہ عرشی صاحب دہلی میں آئے ہوئے تھے۔ میں نے انہیں اپنے غریب خانے پر کھانے کی دعوت دی۔ یہ ان کی عظمت تھی کہ انہوں نے ایک دفعہ بھی انکار نہیں کیا اور فوراً راضی ہو گئے۔ یہ بات میں اس لیے کہہ رہا ہوں کہ جس زمانے میں، میں کروڑی مل کالج میں لیکچرر تھا تو ایک پروفیسر صاحب کو میں نے کھانے پر بلایا۔ انہوں نے بڑی بدتمیزی کے ساتھ انکار کر دیا اور بعد میں انہوں نے ایک اور صاحب سے شکایت کی۔ ''اب بتایئے کہ لیکچرروں کی بھی یہ ہمت ہو گئی کہ وہ پروفیسروں کو اپنے گھر پر کھانے کے لیے بلاتے ہیں۔''

عرشی صاحب کا علمی مرتبہ وہ تھا کہ میں تو کیا وہ پروفیسر صاحب ان کے پیروں کی خاک بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ تشریف لائے۔ وہ مجھ سے اور اسلم پرویز سے جو محبت کرتے تھے تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہمیں اپنے ہی مرتبے کا سمجھتے ہیں۔ خیر وہ ہمارے یہاں کھانے پر آئے۔ ہم بس تین آدمی تھے۔ میں اسلم پرویز، اور عرشی صاحب قبلہ۔ ان دنوں نیاز فتح پوری پاکستان جا چکے تھے اور اکبر علی خاں ان کا رسالہ ''نگار'' شائع کر رہے تھے۔ مجھے خیال تھا کہ یہ رسالہ نقصان میں چل رہا ہے اس لیے میں نے عرشی صاحب سے کہا قبلہ! آپ اکبر کو منع کیوں نہیں کرتے، نگار کی اشاعت میں تو ان کی پوری تنخواہ خرچ ہو جاتی ہوگی۔ عرشی صاحب مسکرائے اور کہنے لگے کہ اکبر اس رسالے پر خرچ تو کرتے ہیں مگر میں یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا ہوں کہ اگر وہ جوئے یا شراب پر یہ رقم خرچ کرتے تو میں کیا کر لیتا۔ یہ تو علمی کام ہے۔ انہوں نے یہ بات کچھ اس طرح کہی کہ میری کچھ اور کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

ایک دفعہ پٹھانوں پر گفتگو ہوئی۔ میں نے پٹھانوں کو جان باز لیکن جاہل کہہ دیا۔ عرشی صاحب کے چہرے پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہو گئے۔ کچھ دیر خاموش رہے اور پھر کہنے لگے کہ آپ تو خود پٹھان ہیں اور پھر پٹھانوں کو جاہل کہتے ہیں۔ میں کسی کو مشورہ نہیں دیتا لیکن چونکہ آپ کی رگوں میں وہی خون ہے جو میری رگوں میں ہے اس لیے آپ سے کہوں گا کہ پٹھانوں کی تاریخ پڑھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ پٹھانوں نے علمی میدان میں کیسے عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے ان علما کے علمی کارناموں کا تفصیل سے ذکر کیا جو پٹھان تھے۔ میں

سمجھ گیا تھا کہ عرشی صاحب کو میری بات ناگوار گزری ہے لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا اور اب میرے بس میں کچھ نہیں تھا سوائے اس کے کہ عرشی صاحب جو کچھ کہتے رہیں میں ان کی ہاں میں ہاں ملاتا رہوں۔ جب عرشی صاحب اپنی بات کہہ چکے تو میں نے عرض کیا میں نے یہ بات مذاق میں کہی تھی۔ عرشی صاحب نے کہا کہ پٹھانوں کے بارے میں یہ بات مذاق سے بھی نہیں کہنی چاہیے ورنہ اس سے دوسرے لوگوں کو ہمیں برا بھلا کہنے کا موقع ملتا ہے۔

عرشی صاحب نے اپنی زندگی کا آغاز ایک جرمن کمپنی کی ایجنسی لے کر شروع کیا تھا۔ چونکہ یہ کام ان کے مزاج کے مطابق نہیں تھا اس لیے کامیاب نہیں ہو سکے۔ کچھ عرصہ ندوۃ العلماء سے منسلک رہے۔ یہاں بھی کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ ۱۹۳۲ء میں وہ رضا لائبریری (رام پور) کے ناظم مقرر ہوئے۔ اس کا قصہ دلچسپ انداز میں شبیر علی خاں شکیب صاحب نے اپنے مقالے ''عرشی صاحب کچھ یادیں کچھ باتیں'' میں اس طرح کیا ہے:

> ''عرشی صاحب مطالعے کے لیے اکثر رضا لائبریری جاتے تھے۔ انہیں پتہ چلا کہ لائبریری میں ناظم کا عہدہ خالی ہے۔ چونکہ ملازمت کی ضرورت تھی اس لیے انہوں نے بھی درخواست دے دی۔ انٹرویو ہوا جس میں ایک مسٹر ابو محمد صاحب موجود تھے۔ وہ بقول عبدالسلام صاحب ذرا سخت مزاج تھے۔ انہوں نے شروع ہی میں عرشی صاحب سے کہا رام پور میں کہاں ایسا شخص ہو سکتا ہے جو اس عظیم ذمے داری کو سنبھال سکے۔ اگر کوئی ایسا ویسا ہوتا تو ہمت ہار جاتا مگر عرشی صاحب نے ابو محمد صاحب کے سوالوں کا جواب بڑے اعتماد اور اطمینان سے دیا۔ انہوں نے بتایا کہ لائبریری میں کیا خرابیاں ہیں اور ان خرابیوں کی اصلاح کے لیے ان کے مشورے کیا ہیں۔ ابو محمد صاحب کا رویہ کچھ نرم پڑا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ انہوں نے ناظم کے عہدے پر عرشی صاحب کا تقرر کر دیا۔ اس زمانے میں امپیریل لائبریری (کلکتے) کے ریٹائر لائبریرین جے۔ اے چیپ مین لائبریرین مقرر ہو کر رام پور آئے اور عرشی صاحب کو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔ عرشی صاحب نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور جو کچھ سیکھا اس کا فائدہ لائبریری کو پہنچا۔ چیپ مین اردو نہیں جانتے تھے اس لیے عرشی صاحب کو ان سے ہر وقت انگریزی میں بات کرنی پڑتی تھی جس کی

وجہ سے عرشی صاحب کی انگریزی بہت اچھی ہوگئی۔ اس دوران خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں کیٹلاگنگ کا کام ہو رہا تھا۔ جب کوئی ایک جلد تیار ہو جاتی تو وہ چیپ مین کو بغرض منظوری بھیج دی جاتی۔ چیپ مین وہ کیٹلاگ عرشی صاحب کے سپرد کر دیتے اور عرشی صاحب اس کیٹلاگ کا بغور مطالعہ کر کے اس میں جو غلطیاں ہوتیں، ان کی نشان دہی کر دیتے۔ اس کام سے عرشی صاحب کو بہت فائدہ پہنچا۔ انہوں نے رضا لائبریری کی جو فہرست سازی کی وہ اسی وجہ سے بین الاقوامی معیار کی ہے۔"

عرشی صاحب نے لائبریری میں اتنی محنت اور لگن سے کام کیا کہ بعد میں وہ لائبریرین اور پھر ڈائرکٹر کے عہدے پر فائز کیے گئے۔ یہ لائبریری اپنی کتابوں اور دوسرے مواد کے اعتبار سے بہت اہم تھی لیکن اس کو جس سلیقے سے مرتب کیا گیا تھا اس کی وجہ سے یہ لائبریری ایشیا کی اہم ترین مشرقی لائبریریوں میں شمار ہونے لگی۔

عرشی صاحب سے میری آخری ملاقات ۱۹۸۰ء میں ہوئی تھی۔ وہ سخت بیمار تھے اور میڈیکل چیک اپ کے لیے دہلی آئے ہوئے تھے۔ ان کا قیام کلب علی خاں صاحب کے یہاں تھا۔ میں ان سے جب ملنے گیا تو کافی دیر تک ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ عرشی صاحب کی آواز میں بہت نقاہت آ چکی تھی اور ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بہت کوشش کر کے بول رہے ہیں۔ ان دنوں عرشی صاحب دیوان غالب نسخۂ عرشی کا دوسرا ایڈیشن زیر طبع تھا۔ عرشی صاحب نے کہا کہ میں دیوان غالب کی طباعت کے سلسلے میں آپ کو کئی خط لکھ چکا ہوں مگر شاید مصروفیات کی وجہ سے آپ جواب نہیں دے سکے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ کا جب بھی کوئی خط آیا ہے میں نے فوراً جواب دیا ہے لیکن آپ کے خطوط سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ میرے خطوط آپ تک نہیں پہنچے۔ غالباً آپ کے دفتر میں کوئی صاحب ایسے ہیں جو آپ کی ڈاک روک لیتے ہیں۔ عرشی صاحب ایک دم خاموش ہو گئے اور مجھے کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے انہیں بھی اس کا علم تھا کہ ان کی ڈاک روکی جاتی ہے۔ کہنے لگے کہ بھائی امیری بیماری کی وجہ سے کچھ لوگ ناجائز فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ آپ اتنا کیجئے کہ وہ نسخہ چھاپ دیجئے۔ بعض مجبوریوں کی وجہ سے اس کی طباعت میں تاخیر ہوئی مگر بہر حال وہ چھپ گیا۔

عرشی صاحب کا سینہ جس طرح علم کا دفینہ تھا اسی طرح انہوں نے رضا لائبریری رام پور

کو بھی علم کا خزینہ بنا دیا۔ مراد یہ ہے کہ کوئی کتب خانہ محض اس بنا پر علم کا خزینہ قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس میں انتہائی نادر اور نایاب ذخیرہ کتب اور مخطوطات ہے۔ خراب ہاتھوں میں پڑ جانے کے سبب ہم نے علم کے ایسے کئی خزینوں کو عراق کے نادر میوزموں کی طرح لٹتے اور خراب ہوتے دیکھا ہے۔ یہ اہل علم و دانش کی خوش نصیبی ہے کہ رضا لائبریری جیسے علمی خزینے کا بندوبست عرشی صاحب کے ہاتھ میں آیا جو صاحب علم ہی نہیں علم کے قدر دان بھی تھے اور اپنے انتہائی مشرقی انداز کے طرز معاشرت کے باوجود اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی اور انتظامی امور کی دیکھ بھال کے معاملے میں انتہائی لائق اور efficient انسان تھے۔ باوجود اس کے وہ اپنے ذاتی علمی کاموں میں انتہائی مستغرق رہتے تھے وہ لائبریری سے استفادہ کرنے والے ہر سطح کے اسکالر کے لیے وقت نکال لیتے تھے۔ کتب خانے کی نایاب سے نایاب اور قدیم سے قدیم کتاب اسکالر کی میز پر چند منٹ میں حاضر کر دی جاتی۔ لائبریری کے کیٹلاگ اور شیلفوں پر رکھی ہوئی کتابوں کے درمیان ایک اور ایک کی ہم آہنگی (One to One Correspondence) تھی۔ آپ آنکھ بند کر کے کسی کارڈ پر انگلی رکھ دیجئے، وہ کتاب شرطیہ آپ کے سامنے حاضر کر دی جائے گی۔ اس ہنرمندی میں عرشی صاحب کی علمیت، علمی رویہ اور ان کی علمی دیانت داری یہ تینوں چیزیں شامل تھیں اور اسی سے مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی زندگی کی عبارت ہے۔ اتنے بڑے علمی کاروبار زندگی کے باوجود اخلاقی سطح پر نہ وہ بڑے لوگوں کی طرح مردم بیزار تھے اور نہ مذہبی احکام کی ادائیگی کی حرف سے غافل۔ تو کیا انسان کامل کی اس کے علاوہ کوئی اور تفسیر ہو سکتی ہے؟ میرے خیال میں شاید نہیں!

□□□

ماخذ: مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، خلیق انجم، انجمن ترقی اردو دہلی، ۲۰۰۸ء

●●●